الطاف فاطمہ کے ناول ''خواب گر'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر عظمت رباب، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور
ڈاکٹر صائمہ ارم، جی سی یونیورسٹی لاہور

Abstract

The independence of Pakistan and the migration of large number of Muslim families from all over India to the provinces comprising Pakistan was a great historical experience. The social upheaval gave birth too many stories of heart rending experiences. Many a novel and short stories have been written on the subject. Ms Altaf Fatima has written four novels which encompassed the tragic tragedy. All of them revolve round the experience of the creation of Pakistan. In this paper, Dr. Azmat Rubab in cooperation with Dr. Saima Iram analysis her novel "Khaab Gar" which belongs to the region of Tibbat Khurd and a village named "Baltoro".

اردو افسانوی ادب میں الطاف فاطمہ کا نام نمایاں مقام کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جو موضوعات پیش کیے ہیں۔ ان میں غالب موضوع ہجرت، آزادی کا تصور اور ہجرت کے مسائل و مشکلات کا بیان ہے۔ ان کے چار ناول منظرِ عام پر آئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ نشانِ محفل
۲۔ دستک نہ دو
۳۔ چلتا مسافر
۴۔ خواب گر

اگر ان ناولوں کی تکنیک پر غور کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ ناول عموماً تین اہم مراحل پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصے میں آزادی سے قبل کے حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں، دوسرے حصے میں تقسیم اور ہجرت کے مسائل و مشکلات کا بیان ہے اور تیسرے حصے میں پیش منظر کے طور پر آزادی کے بعد کی صورتِ حال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

الطاف فاطمہ کے ناول عموماً ایک دو یا مرکزی کرداروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور باقی کے کردار اسی کردار کے گرد گھومتے یا اثر انداز ہوتے دکھائے دیتے ہیں۔

الطاف فاطمہ کا ناول ''خواب گر'' جمہوری پبلی کیشنز لاہور سے 2016ء میں شائع ہوا۔ اس کے انتساب میں اس ناول کا مرکزی خیال ہے:

''خواب دیکھنے کے لیے انتظار کا حوصلہ بھی ہو تو تعبیر بھی مل ہی جاتی ہے۔''

ناول کا آغاز ایک رات سے ہوتا ہے جس میں تبت خورد سے تعلق رکھنے والا ایک بیمار بوڑھا شخص ابراہیم خواب دیکھتا ہے۔ وہ اس خواب کے بارے میں سوچتا ہے کہ اس عمر میں ایسا خواب اس کی خواہشات کا ردِعمل ہے یا مستقبل کی کوئی نوید۔

> ''خواب تھا کہ ایک خواہش ایک تمنا اور آرزو کا نیتا کہ نکھوں میں گھل مل کر خواب کے سانچے میں ڈھل گیا تھا، بہر حال یہ ایک مکمل اور پیا سا خواب تھا اور خواب دیکھنے والے بہر حال مبارک ہوتے ہیں۔ وہ خواہ ابراہیم خلیل اللہ ہو، یوسف صدیق ہو، سلطان ٹیپو ہو یا پھر بامِ دنیا کی بلندیوں کے درمیان دنیا کی نظروں سے پوشیدہ تبت خورد کا رہنے والا بیمار اور غم زدہ کا کا ابراہیم کہ اچھے اور آرزو مند خواب دیکھنے والے سچے، سادہ اور مخلص ہوتے ہیں۔ ان کی نیک تمنائیں ان کی آنکھوں میں خواب بن کر اترتی ہیں۔ اجلے، ستھرے اور نیک قدم خواب۔ چوگان کے توانا، مضبوط مشکی گھوڑوں کی مانند ہانپتے ہوئے کہ ان کے سواروں کے ہاتھ ان کی باگوں پر نہ ہوں تو بھی وہ ان کو اپنی پشت پر اٹھائے اپنی مرضی کی سمت اڑے چلے جاتے ہیں۔''(1)

اسی رات ابراہیم کی بھابی سکینہ نے بھی خواب میں اپنے شوہر اسماعیل کو دیکھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ علی مردان نیچے جا رہا ہے۔ اس کو بولو کہ وہاں پہنچتے ہی ابراہیم کے لیے دوا خرید لے اور جتنی جلد ہو سکے بھیج دے۔ مجھے ابراہیم کی طرف سے فکر ہے۔ سکینہ نے کہا کہ اس میں تو کئی مہینے لگ جائیں گے تو اس کے شوہر نے کہا:

> ''بولا سکینہ اب بہت جلدی جلدی پہنچ سکے گی ہر شے۔ آسمانوں پر سے اڑتی ہوئی آئے گی۔ میں نے پوچھا ایسا کیسے ہوگا اسمٰعیل؟ تو بولتا ہے۔۔۔۔۔ سکینہ میں تم کو بتاتا ہوں کہ اب ہوائی جہاز اترا کرے گا یہاں ہماری وادی میں۔ اور یہ کہتے کہتے وہ مصلے سمیت غائب ہو گیا۔''(2)

اسی سے ملتا جلتا خواب ابراہیم نے بھی دیکھا کہ اس کا علاقہ ''بلتورو'' جگنوؤں، ستاروں اور موتیوں ہیروں کی روشنی سے چمک رہا ہے۔ وہ خواب میں اونچی آواز میں بولتا ہے:

''پہاڑوں کی ان اونچی چوٹیوں کی قسم میں تم سے بار بار کہوں گا کیا ہوا جو موسیٰ علیہ السلام نے اُس کو اس عظیم گلیشیر سے آواز نہیں دی اور موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر جا کر اُسے آواز دی تو پھر کیا ہوا وہ تو خود ہی ہر جگہ موجود ہے اور اس میں اتنی قدرت بھی موجود ہے کہ جہاں چاہے وہ اپنا ظہور کرے، تو پھر دنیا کی اچھی اور خوب صورت جگہ کا انتخاب

کیوں نہ کرے۔ اور پھر یہ ہمارا بلتورو تو اس بامِ دنیا پر ہے اور شاید اس سے بہت قریب بھی اور وہ تو اتنی قدرت والا ہے کہ یہاں سے بہت نیچے بستیوں کے ذرے ذرے میں بھی نور اور روشنی بن کر جلوہ گر ہوتا ہے۔''(3)

اس خواب کی جو ابتدا ابراہیم سے ہوئی اس کی تعبیر اس کے نواسے کے عہد میں پوری ہوئی۔ سکینہ کے خیالات کے حوالے سے یہ بیان بہت اہم ہے:

> ''اس کی ساس یہ بھی کہا کرتی تھی: 'سکینہ جو میری اور تیری سسرال کا زمانہ ہے، اس کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ہر تیسری یا چوتھی پشت میں ایک ایسا بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس پر عمر کے کسی نہ کسی حصے میں جذب اور مجذوبی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ پاگل نہیں ہوتا نہ ہی پیدائشی مجہول یا کم عقل ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر یہ کیفیت دھیرے دھیرے طاری ہوتی ہے کہ معلوم ہو کہ وہ کچھ دیکھتا ہے، اس کو کچھ نظر آتا ہے اور وہ ناقابل فہم بولتا ہے۔ پھر بھی لوگ سمجھتے ہیں، متھو ہے (پاگل ہے) پر وہ تو آشنائے راز ہوتا ہے۔''(4)

فریڈرک ہسٹن سے ملنے کے بعد اسے خواب میں بیمار دیکھنا بھی اسی تعلق کا ایک حصہ تھا جس کی تعبیر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ فروری میں اس کی جانب سے جو خط ابراہیم کو ملا اس میں واضح طور پر درج تھا کہ وہ بہت بیمار ہے اس لیے فوراً اس کے پاس چلا آئے۔ تو ابراہیم اس موقع پر بھی سوچتا ہے کہ اس بار بھی اس نے سچا خواب دیکھا تھا:

> ''وہ خواب دیکھتا اور اپنے خوابوں پر یقین بھی رکھتا تھا۔ خواب دیکھنا بلکہ خوابوں کی تخلیق کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ وہ سوتے میں بھی خواب دیکھتا اور بیداری میں بھی کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا تھا اور ان کی سچائی پر پورا یقین رکھتا تھا۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو کبھی اور سہی خواب کی تعبیر مل ہی جائے گی۔ میرا کام خواب دیکھنا اور اس کی تعبیر کا صبر سے انتظار کرنا ہے۔''(5)

یہ کہانی تین نسلوں کو محیط ہے۔ اس میں الطاف فاطمہ نے تبت خورد کے علاقے بلتورو کے بلتی خاندان کی محنت، جفاکشی، ایمانداری، صبر، استقامت اور خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھنے کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ وہ بار بار مختلف واقعات اور موقعوں پر ان بالتی لوگوں کی ان خصوصیات کا ذکر کرتی ہیں۔ اپنے خاندان کی کفالت کے لیے ابراہیم چھوٹی عمر ہی میں ان پہاڑوں سے اتر کر میدانی علاقوں میں گیا۔ وہ وہاں ایک ہوٹل میں بیرے کی ملازمت کرتا تھا۔ کئی سالوں کے بعد جب وہ واپس اپنے وطن گیا تو وہ بچپن کو پھلانگ کر جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی بھابی سکینہ اور بھائی اسماعیل نے اس کی شادی کے لیے ماہ خاتون کا انتخاب کیا جس کے والد جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس کا منگیتر مہدی کئی سالوں سے نیچے گیا تھا اور اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی نہ ہی کوئی خط اس کی طرف سے آیا تھا۔ شادی کے لیے ابراہیم نے خاص طور پر اپنے کمرے کو تیار کیا۔ اس نے لکڑی کا کام خود بہت ہنر سے سیکھا اور اپنے کمرے کے لیے تین عدد کرسیاں، چار عدد صدلیاں (نیچے اور چھوٹی چوکی نما

سٹول) تیار کیے تھے اور پھر میں نے کرسیوں کے لیے گدیاں، بھیڑ کے ناکارہ اور ناقص اون سے بھر کر تیار کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ کمرے کے فرش پر اس نے کھالوں کی بجائے اون سے بنی ہوئی سرخ اور سیاہ دری بچھائی تھی۔ وہ سارا سامان سج جانے کے بعد تو کمرا ایسا نکل آیا تھا کہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہمارے ہی گھر کا حصہ ہے۔''(6)

شادی کے بعد ابراہیم واپس روزی کمانے چلا گیا اور دوبارہ جب آیا تو اس کی بیٹی ماہ رو چار سال کی ہو چکی تھی۔ اتنی پیاری بیٹی کو چھوڑ کر اس کا دل واپس جانے کو نہیں چاہا لیکن اس کی بیوی ماہ خاتون نے اسے مجبور کیا کہ وہ جائے اور پیسے کمائے تاکہ وہ الگ اپنا مکان لے کر وہاں رہے۔ بادل نخواستہ ابراہیم کو واپس جانا پڑا اور جب وہ کچھ سالوں کے بعد واپس آیا تو اسے پتا چلا کہ ماہ خاتون اپنے سابق منگیتر مہدی کے ساتھ چلی گئی تھی اپنی بیٹی کو چھوڑ کر۔ ابراہیم کے لیے یہ صدمہ بہت جانکاہ تھا لیکن اس نے اس غم کو اپنے دل ہی میں چھپا لیا اور بہت صبر سے ماہ خاتون کا طلاق نامہ اس کے گھر بھجوا دیا اور اپنی بیٹی کو بھابی سکینہ کے سپرد کر کے خود نیچے چلا گیا۔ وہیں راستے میں ست پڑا جھیل پر اس کی ملاقات ایک سیکرٹ سروس کے حاضر سروس انگریز سے ملاقات ہوئی جس کا نام فریڈک ہسٹن تھا۔ اتفاق سے ابراہیم اور فریڈک کے حالات و سانحات مشترک تھے۔ اس کی بیوی مارگریٹ دو بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی تھی اس بنیاد پر کہ فریڈک کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں گھر آنے کا بہت کم وقت ملتا تھا اور وہ مصر ہوتا تھا کہ مارگریٹ مصروف رہنے کے لیے اپنی ساس کی طرح کی گھریلو سرگرمیاں اپنائے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھی اور پھر بار بار اپنی ساس کا حوالہ سن کر وہ چڑتی چلی گئی اور آخر کار اسے چھوڑ کر امریکہ چلی گئی۔

ابراہیم تو اپنی بیوی کے جانے کی توجیہ یوں کر کے اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے:

> ''رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ پورے پانچ سال، چلو اس کے مشورے ہی سے سہی، پھر بھی یہ ایک طویل عرصہ ہے، وہ اس سے اور بیٹی سے دور رہا تو تھا۔ یہ زیادتی ہی کہی جا سکتی ہے۔ بات یہ ہے یہاں ایسی جگہ بیٹھ کر جہاں نمک تک نہیں ملتا، ہماری عورتیں کیا کچھ مانگ سکتی ہیں اور کیا مانگ لیتی ہیں۔ اور میں نے زندگی کے اتنے سال نیچے گزار کر جو دیکھا وہاں عورت کیا کچھ چاہتی ہے اور کیا کیا مانگتی ہے اور پھر بھی وہاں کیا کیا نہیں کرتیں بعض بعض عورتیں!''(7)

فریڈرک ہسٹن کو ابراہیم کی سادگی اور سنجیدگی بہت بھائی اور اس نے اسے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کرنے کے لیے ملازمت کی پیش کی، اس سلسلے میں اس سے رابطہ رکھنے کو کہا اور پرکشش تنخواہ کی پیش کش بھی کی۔ ابراہیم شش و پنج میں پڑ گیا کیونکہ اس نے اس سے قبل ایسی کوئی ملازمت نہیں کی تھی ماسوا ویٹر کے۔ تاہم اس نے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔ وہاں سے جا کر شملہ پرانی جگہ پر بیرا گیری کرنے لگا۔ اسے فریڈ کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ کلو کی ریاست میں آ جائے جہاں وہ فارم ہاؤس ''دی مینر''(MannerThe) میں رہائش پذیر ہے۔ ابراہیم وہاں پہنچا اور اس نے فریڈک ہسٹن کو بہت بیمار پایا۔ فریڈ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا، چند دنوں بعد منالی میں اپنے گھر شفٹ ہو گئے اور بچوں کو بھی وہیں بلوا لیا۔ ابراہیم نے دس سال وہاں گزارے اور گھر واپس نہیں گیا۔ اس

دوران میں اسے پتا چلا کہ علی مردان اور ماہ رو کی شادی ہوگئی ہے تو وہ مزید مطمئن ہوگیا۔ تقسیمِ برصغیر کے حالات سے پریشان ہوکر فریڈ نے اپنے دونوں بچوں کو باربرااور۔۔۔۔کی نگرانی میں انگلینڈ بھجوادیا اور خود وہیں رہا۔اور وہیں کلو میں اس کی موت بیماری کے سبب ہوئی۔

دس سال بعد وہ واپس اپنے علاقے تھلے لا میں آیا تو اس نے دیکھا کہ ماہ رو پورے دنوں سے امید سے تھی۔علی مردان کے ساتھ مل کر اس نے کھیتوں میں کام شروع کیا لیکن اس کی طبیعت خراب سے خراب ہوتی چلی گئی تو علی کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگئی کہ اب وہ پہاڑوں سے نیچے جائے اور رزق تلاش کرنے کا بندوبست کرے۔

ابراہیم کی براہِ راست سوچ،خواب،ارادے یہیں تک اس کے تخیل کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں۔اس کے بعد ناول کے اختتام تک علی مردان کے ذریعے ہی ناول کی کہانی آگے چلتی ہے۔ وہ لاہور میں نیڈو ہوٹل کی ملازمت کرنے لگا اور کافی سال بعد جب وہ گھر گیا تو اس کا بیٹا اسمٰعیل خلیل اللہ دوڑنے بھاگنے والا ہوگیا تھا اور اس کے چچا ابراہیم زیادہ کمزور اور بیمار ہوگئے تھے۔ان کے دور کے عزیز کا بیٹا شاہ رخ ان کے گھر کافی آنے جانے لگا تھا جس پر علی مردان نے اپنے چچا سے بات کی اور اپنی ناگواری کا اظہار کیا تو انھوں نے اسے تسلی دی۔اسے ابراہیم کی موت کی خبر ملی تو وہ پندرہ دن کی چھٹی لے کر گھر آیا اور واپس آنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے کو سکول میں داخل کرا دیا، ماہ رو کو تسلی دی اور اسے اس کی ذمہ داری سمجھائی اور واپس لاہور آ گیا۔نیڈوز ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے آزاد کشمیر کے ایک انجینئر صاحب نے علی کی شستگی،شرافت اور حلیمانہ بردباری سے متاثر ہوکر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔وہ ان کے ساتھ چلا گیا کیونکہ اسے پتا چلا تھا کہ یہ ہوٹل ختم کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ پر ایک نئی طرز کی عمارت تعمیر کی جائے گی۔ چنانچہ اس نے انجینئر صاحب کی آفر قبول کر لی اور ان کے ساتھ چلا گیا۔کچھ سالوں بعد اسے ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کی موت کی اطلاع تھی،اسے یہ خط تین مہینے بعد ملا تھا کیونکہ یہ لاہور کے پتے پر پہنچا تھا اور اس تک پہنچتے پہنچتے تین ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔اس کا بیٹا خلیل دس سال کا ہو چکا تھا اور گھر میں شاہ رخ کی آمد کو ناپسند کرتا تھا۔ایک دن اس نے سکول سے واپسی پر کمرے میں جھانکا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا،اس نے کمرے کی کنڈی باہر سے لگا دی اور باہر دروازے پر بیٹھ گیا۔لوگوں کے پوچھنے پر اس نے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا وہاں لوگوں کا جمگھٹا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب علی مردان وہاں پہنچا،اس نے جو صورت حال دیکھی اسے سمجھداری سے حل کیا۔ پھوپھی فاطمہ کو بلایا اور ماہ رو کو ان کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ اب اس کے قابل نہیں رہی،وہ اس کی شادی شاہ رخ سے کرا دیں اور خود کچھ دنوں بعد وہ خلیل کو لے کر لاہور آ گیا۔

اس کے بعد کے واقعات خلیل کے گرد گھومتے ہیں۔منظر لاہور آرٹس کونسل کے سٹوڈیو ہٹ کا ہے جہاں پینٹنگ اور میوزک کلاسز میں لڑکے اور لڑکیاں آ کر مشق کیا کرتے تھے۔ وہیں چھوٹی سی کینٹین میں شہلا کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی جو کہ خلیل تھا۔شہلا نے اس کی زندگی میں مثبت تبدیلی پیدا کی۔وہ اسے اپنے گھر لائی اور پڑھائی کی طرف اس کی توجہ دلائی،شہلا کی ترغیب پر اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔شہلا اور اس کی ماں بیرون ملک چلے گئے

اور خلیل نے میڈیکل کا امتحان پاس کر لیا۔اسلام آباد آرٹس کونسل میں نمائش کے دوران اس کی ملاقات شہلا سے ہوئی جو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔علی مردان سے ملاقات کے دوران اسے پتا چلا کہ وہ جس انجینئر کے پاس آزاد کشمیر میں ملازم تھا، وہی تھا جسے شہلا محبت کرتی تھی اور جو محاذ پر لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔اسی بنا پر شہلا نے ساری زندگی شادی نہیں کی۔علی مردان،خلیل کے ساتھ واپس اپنے گاؤں چلا گیا،سکردو ایئر پورٹ پر روشنیاں دیکھ کر اسے اپنے چچا کے خواب کی تعبیر دکھائی دی اور مزید کے لیے اس نے اپنے علاقے تھلے لا میں ایک ہسپتال تعمیر کرنے کا ارادہ کیا جہاں خلیل بطور ڈاکٹر اپنی خدمات انجام دے گا۔ناول کا اختتام سکردو کے ہوائے اڈے پر ہوتا ہے جہاں اتر کر علی مردان اپنے بیٹے سے مخاطب ہوتا ہے:

> ''دیکھو،دیکھو خلیل،سکردو کی ساری رونق اور چہل پہل۔یہ تمھارے نانا کے خواب کی تعبیریں ہی تو ہیں،جو زندگی کے سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیرتی نظر آ رہی ہیں۔''(8)

الطاف فاطمہ نے اس ناول میں کرداروں،واقعات اور بیانیہ جملوں کے ذریعے متعدد مقامات پر بلتیوں کی خصوصیات کو بیان کیا ہے جس میں ان کی جفاکشی،صبر،برداشت،قناعت اور وفاداری جیسی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ابراہیم پہلی بار جب اپنے گھر سے پیسے کمانے پہاڑوں سے نیچے اپنے گھر سے دور گیا اور جب وہ کئی سالوں کے بعد واپس آیا تو اس کا احوال مصنفہ نے یوں بیان کیا ہے:

> ''اور اب وہ برخوردار بڑے ہوٹل کا معزز بیرا،خود اپنی بستی میں آیا تو کس شان سے؟عاجزی اور حلیمی کی شان۔یہ تو اس پوری قوم کا وصف تھا۔عاجزی،حلیمی اور دیانت کہ وہ اپنی بستی میں سر جھکا کر عاجزی سے داخل ہوتے،اسی لباس اور ادا کے ساتھ جو ان کا اور فقط ان کا ہی لباس ہے۔ انھوں نے اپنی زمین پر کبھی بھاری اور کڑے قدم نہ ڈالے نہ ہی اپنی مٹی کو ٹھوکر لگائی۔وہ اپنی بزرگوں کے آگے جھک جانے والے لوگ تھے۔اپنے آشنا جبیبوں کو،عزیزوں کو گلے سے لگانے والے اور ہر برے وقت میں دل و جان سے ایک دوسرے کے کام آنے والے لوگ۔''(9)

ابراہیم کو جب پتا چلا کہ اس کی بیوی ماہ خاتون اپنی بیٹی کو چھوڑ کر اپنے عاشق مہدی کے ساتھ چلی گئی ہے تو اس نے صبر کی سل اپنے دل پر رکھ لی:

> ''وہ اپنے دوست کی رضا پر راضی تھا۔اسی دوست کی رضا پر جس کے آگے وہ انتہائی عاجزی سے جھکتا تھا اور ہر مرتبہ عہد کرتا تھا کہ ''میں تیری رضا پر راضی ہوں'' اور ایسا کرتے ہوئے ابراہیم کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے نیچے اترا چلا آ رہا ہو۔آسمان جو اتنا قریب محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم ایک ہاتھ بھی ذرا اونچا اٹھائیں تو اس کو چھو لیں۔''(10)

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ہونے والی تبدیلیوں نے بھی ان بلتیوں کی طمانیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا کیونکہ صرف ابراہیم نہیں بلکہ اس کا ہر ہم وطن ایک ان لکھے قانون کی پاسداری کرتا تھا اور اس سے سرکشی ان کے خون

کا حصہ نہیں بنا تھا۔مصنفہ لکھتی ہیں:

''اُس دور تک یہ واقعی نا قابلِ یقین قسم کی انسانی مخلوق ہوا کرتے تھے اور اس میں شک وشبہ یا کسی قسم کے مبالغے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ جہاں بامِ جہاں کی چھتری تلے پھیلے ہوئے پلیٹو (جو تبت خورد کے نام سے جانا جاتا ہے) میں بسنے والے یہ محنت کش بلتی مسلمان اپنے مخصوص خصائل اور کردار کا تحفظ کرنا بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس وقت یعنی جب دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی، دنیا سکڑ کر بہت چھوٹی اور محدود ہوتی جا رہی تھی، تہذیبوں، اقدار اور عقائد کے خلط ملط اور اختلاط کے سبب فاصلے مٹ رہے تھے۔۔۔۔۔لیکن اسی دور میں تبت خورد کی بلندیوں سے اتر کر آنے والے بلتی محنت کش پورے سکون اور روح کی طمانیت کے سارے نشیب وفراز سے گزرتے زخوں (مشکیزوں کو جوڑ کر بنائی کشتیوں) کے ذریعہ شہ زور دریاؤں کو عبور کر کے کوہستانوں کی نا قابلِ بیان بلندیوں اور ڈھلانوں سے چیونٹیوں کے قافلوں کی قطار کی مانند رینگتے اور چلتے ہوئے نیچے کو اترتے۔۔۔۔۔اپنے اندر صحت اور محنت کے بے پناہ حوصلے کی دولت سمیٹے میدانی زندگی کی اس بے چین رَو میں شامل تو ہوتے لیکن فقط اپنے حصے کی محنت کرنے اور روزی کمانے کے علاوہ کوئی سروکار نہ رکھتے۔''(11)

''ان کے قومی کردار کا سب سے نمایاں وصف، جو بالخصوص ان کے انگریز آقاؤں کو حیران کر دیا کرتا تھا، یہ تھا کہ مکمل طور پر ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ اجڈ یا جاہل نہ تھے۔بڑے مہذب اور نرم خو ہونے کے علاوہ بغیر کسی تادیب یا تنبیہ کے فطرتاً پاک باز، کھرے اور سچے تھے۔تقویٰ اور پرہیزگاری ان کی قومی شناخت تھی۔''(12)

فریڈرک ہسٹن نے ابراہیم کو بلانے کے لیے جو خط بھیجا اسے پڑھوانے کی اسے کوئی جلدی نہ تھی۔اس حوالے سے ان لوگوں کی ایک اور خاصیت ناول نگار نے یوں درج کی ہے:

''یہ بھی ان کے کردار اور مزاج کا ایک پہلو تھا کہ خوشی اور غم، حیرت اور غصے کی زبردست سہار تھی۔کبھی کسی حال میں اپنے اضطراب، شوق کا ضرورت سے زیادہ اظہار نہ کرنا اور آپے سے باہر نہ ہونا۔''(13)

فریڈرک ہسٹن کے کردار کے حوالے سے نوآبادیاتی نظام کی وضاحت کی گئی ہے۔فریڈرک اپنے والد کرنل البرٹ ہسٹن کی فرنٹیئر فورسز کی سیکرٹ سروس میں پوسٹنگ کے سبب قبائلی علاقوں میں پلا بڑھا تھا اور ملازم زر بادشاہ اور اس کی بیوی گل خانم کی گود میں پرورش پائی تھی چنانچہ عام انگریزوں کے برعکس وہ یورک کو ناپسند کرتا تھا اور اس میں قبائلی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔

''مغربی سیاست کا وہ فرسٹریشن جو اب اپنی راہ کے کانٹے چن چن کر دوسروں کی جھولیوں اور

راستوں میں بچھانے کا سلسلہ شروع کر رہا تھا، جس کا آغاز انتہائی صبر و جارحیت کے تحت اسرائیل
کی ریاست کا قیام اور ایسے ہی دور سے اقدامات کے ذریعے ایشیا میں قائم اپنے نوآبادیاتی نظام کو
ڈگمگاتے اور ہلتے دیکھ کر ایک نئے استعمار کی بنیادیں استوار کر رہا تھا۔'' (14)

فریڈرک اپنی بیوی مارگریٹ سے وہی توقعات رکھتا تھا جیسا کہ اس کی مما نے زندگی گزاری لیکن یہ اس کی غلطی اور خام خیالی تھی۔ یہ دور اُس عہد سے بہت مختلف تھا جب:

''اٹھارہ سو ستاون اور اس سے بھی بہت پہلے منٹگمری وغیرہ کے زمانوں میں کہ ان کے خاوندوں کی زندگیاں تو گھوڑوں کی پیٹھوں پر کٹ رہی ہوتی تھیں اور وہ بے چاری میم صاحبان گھٹن، لُو اور دھوپ کے تھپیڑوں کی زد میں رہ کر مکھی، مچھروں اور ہندوستان کے جملہ حشرات الارض سانپ بچھو سے لے کر لال بیگ تک سے مقابلے پر ڈٹی رہتی تھیں۔ گرمی دانوں اور پھوڑوں پھنسیوں سے نجات ملتی تو پیچش، یرقان اور ملیریا جیسے عارضوں میں مبتلا، شوہروں سے دوری اور مجبوری کی زندگی اکیلے ڈھنڈھار بنگلوں میں گزارتیں اور بنگلے پر تعینات آیاؤں، سائیسوں، خانساموں اور بیروں پر حکمرانی کرتے ہوئے بڑے فخر سے سوچتی تھیں کہ وہ اور ان کے رفیقِ حیات مل کر تاجِ برطانیہ کے تحفظ اور اس کے نوآبادیاتی نظام کے استحکام کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔''

نوآبادیاتی نظام کا یہ رخ جس کا شکار ان فوجیوں کی بیویاں ہوتی تھیں، اس نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے کہ عموماً اسے سیاسی، سماجی اور معاشی حوالے سے جانچا جاتا ہے لیکن خانگی حوالے سے اس کے متاثرین میں بیگمات بھی شامل ہیں۔ یہ نقطۂ نظر ایک عورت ہی عمدگی سے بیان کر سکتی تھی اور مصنفہ نے اسے ایک انگریز خاندان ہی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

انگریزوں کی عیش پرستی اور برصغیر میں ان کے استعمار کے حوالے لیلیٰ کے خیالات کے حوالے سے مصنفہ یوں ذکر کرتی ہیں:

''۔۔۔۔ یہ برصغیر تو برطانیہ کی سب سے بڑی اور مہذب کالونی ہے، گویا تاجِ برطانیہ کا سب سے
زیادہ قیمتی اور آبدار آبگینہ ہے۔ ورنہ تو فیڈریٹڈ، ملایا، سنگاپور، برما اور دوسری کالونیوں میں تو ان
کی رنگ رلیاں پورے عروج پر ہوتی ہیں۔ ان علاقوں میں تو صاحب کھل کر زندگی گزارتا ہے۔
اور اب یہ ہمارا فریڈ ہے ناں، اس کی تو اٹھان اور پرداخت ہی اور انداز پر ہوئی ہے۔'' (15)

تقسیمِ برصغیر کے بعد کی صورت حال کو بھی انگریزوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے اور یہ نقطۂ نظر عموماً تاریخی حوالے سے مختلف ہے کیونکہ یہ انفرادی سوچ ہے جبکہ نوآبادیاتی نظام تو ایک اجتماعی فکر اور سوچ کی بات ہے۔ فریڈرک ہسٹن اپنے دونوں بچوں کو ہیلیری اور باربرا کے ساتھ انگلینڈ بھجوا دیتا ہے لیکن خود وہیں رہنے کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی توجیہ یوں کرتا ہے:

''ہم برٹش لوگ جو اس ملک میں رہے اور رہ رہے ہیں، ان کی عادتیں عام انگریزوں سے اتنی مختلف ہو جاتی ہیں کہ اب وہاں صرف وہی لوگ گزارا کرسکیں گے جو جوان، تندرست اور ایک دم فٹ ہیں اور پھر بہت دولت کما کر وہاں رہ چکے ہیں۔ ہماری قوم بڑی جنگ کے بعد بالکل ہی ایک نئی اور سخت زندگی سے دوچار ہونے والی ہے۔ اب جبکہ کلونیل دور ختم ہو رہا ہے۔'' (16)

ناول میں مصنفہ نے متعدد مقامات اور مواقع پر اپنے خیالات کا براہِ راست اظہار بھی کیا ہے جو ناول نگاری کے فن کے پیشِ نظر ایک خامی سمجھی جاتی ہے لیکن یہ انداز ان واقعات کی تفہیم میں اتنا مددگار ہوتا ہے کہ اس کی خامی کے بجائے اس کی خوبی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ فریڈرک کی بیوی مارگریٹ کے خیالات کے حوالے سے امِ لیلیٰ کے خیالات بیان کرتے ہوئے ناول نگار اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ:

''اس حد تک جو شوہر اپنی ماؤں کے حوالے سے اپنی بیویوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو پھر عورت کی فطرت میں حسد اور ضد دونوں ہی مادے موجود تو ہوتے ہیں اور ان کے رہ رہ کر سر اٹھانے کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔'' (17)

میجر مسعود کی بیگم امِ لیلیٰ کے کردار کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مصنفہ اپنا بیانیہ یوں درج کرتی ہیں:

''ان دنوں بازاری سوئیٹر خرید کر بچوں کو پہنانے کو رواج نہ تھا، گھروں میں سوئیٹر بُننا فیشن ایبل بات سمجھی جاتی تھی۔ بازاری چیزوں کو بجز امپورٹڈ سوئیٹروں اور جرسیوں کے کافی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لگتا یوں ہی تھا کہ اون سلائیاں ہاتھ میں تھام لو تو دنیا جہان کی فکروں سے آزاد ہو کر ذہن صرف خانوں کے شمار اور پیٹرن کے حساب میں مصروف رہتا ہے لیکن یہ ہے کہ اُون سلائیاں ہوں یا اُون کروشیا، ہاتھ میں پکڑی نہیں اور خیالات کی یلغار ہوئی نہیں۔ ان سوچوں اور خیالات میں زیادہ تر گزرے ہوئے واقعات اور دنوں کی فلیش بیکس ہی ہوتے ہیں۔ ماضی کے پلٹ پلٹ کر آنے والے ان لمحوں میں حال کی لہریں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔'' (18)

پاکستان کے قیام کے بعد وہ سیاسی گروہ جو اس کی ترقی سے بے نیاز محض اپنی پروجیکشن میں زندہ تھا اسے علی مردان کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے جو اگرچہ ناول کے پلاٹ اور کہانی میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کرتا لیکن اس کے ذریعے مصنفہ نے سیاسی حوالے سے اس نام نہاد انٹلکچوئل گروہ پر گہرا طنز کیا ہے، جس کا مطمحِ نظر محض اپنی پروجیکشن ہے۔ یہ گروہ باتیں تو بہت بگھارتا ہے لیکن عملی طور پر صفر ہے۔ یہ بنیادی طور پر خود غرض اور موقع پرست لوگوں پر مشتمل گروہ ہے جو بظاہر تو پاکستان کے ہمدرد ہیں لیکن عملی طور پر اس کے خلاف دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے ناول نگار ایک محبِ وطن پاکستانی کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں اور ان کے طنز کا نشانہ یہ گروہ اور ان کی بیگمات بنتی ہیں۔ انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہم سے سے ہر ایک کے خیالات ہیں:

''ان کی سمارٹ اور خوبرو بیبیاں اپنے ہمسایہ ملک سے درآمد کی ہوئی اعلیٰ درجہ کی کاٹن کی پرنٹڈ

نفیس ساڑھیوں ، بلاؤزوں اور بے حد الٹرا ماڈرن ملبوسات زیب تن کر کے اپنی گاڑیوں کو خود چلاتی ہوئی ان کے فلاکت زدہ گھرانوں میں بہ نفسِ نفیس خود آتیں۔ان کی بے کسی پر موٹی موٹی ضخیم اور غیر ملکی زبانوں میں طویل رپورٹیں تیار کر کے باہر ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے بیرونی دوروں پر روانہ ہو جاتیں۔الحمرا کے ڈراموں،فنکشنوں سے اٹھ کر ایسی خواتین اکثر بیری احاطے کی طرف بھی آ نکلتیں اور وہاں کے مکین دھوبیوں ، درزیوں اور ہوٹلوں کے بیروں کی زوجگان کو کرید کرید کر ان کی فلاکت اور عسرت سے زیادہ ان کے خاوندوں ، ماں باپ اور بھائیوں کے ناروا سلوک کی ٹوہ لگاتیں اور یہی تو موضوع ہوتا کہ باہر ہونے والی کانفرنسوں کی عالمی منڈیوں میں یہی تو سب سے بڑھیا بکاؤ مال ہے۔''(19)

الطاف فاطمہ کے دیگر ناولوں کی طرح اس میں بھی مرکزی موضوع ہجرت اور اس سے متعلقہ مسائل و مشکلات ہیں لیکن اس ناول میں ہجرت کا موضوع سکردو و بلستستان کے لوگوں کے مسائل و مشکلات سے جڑا ہوا ہے۔اگرچہ اس میں جو عہد بیان کیا گیا ہے وہ قبل از تقسیمِ برصغیر ہے اور اس میں تقسیم کے بعد کے اثرات بھی مرکزی کردار کے مشاہدے کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں لیکن دیگر ناولوں کے مقابلے میں اس میں فرق یہ ہے کہ اس ناول میں ان لوگوں کے تاثرات بیان کیے گئے ہیں جو تقسیم میں کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئے اور محض فیشن اور گرما گرم جدید موضوع کی بنا پر تقسیم کے بارے میں بات کرتے تھے۔درج بالا اقتباس اس موضوع کے حوالے سے بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ناول نگار نے جس درجہ دکھ سے اس طنز کو بیان کیا ہے وہ الفاظ کے پیرائے میں سمو دیا ہے۔سکردو کی بتدریج معاشی اور معاشرتی ترقی کے حوالے سے یہ ناول اہمیت کا حامل ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ الطاف فاطمہ،خواب گر،لاہور: جمہوری پبلیکیشنز،ص7

۲۔ ایضاً،ص22

۳۔ ایضاً،ص33

۴۔ ایضاً،ص34

۵۔ ایضاً،ص166

۶۔ ایضاً،ص26

۷۔ ایضاً،ص37

۸۔ ایضاً،ص272

۹۔ ایضاً،ص15

۱۰۔ ایضاً، ص32

۱۱۔ ایضاً، ص41، 42

۱۲۔ ایضاً، ص43

۱۳۔ ایضاً، ص167

۱۴۔ ایضاً، ص42

۱۵۔ ایضاً، ص156

۱۶۔ ایضاً، ص208

۱۷۔ ایضاً، ص128

۱۸۔ ایضاً، ص148

۱۹۔ ایضاً، ص245

مآخذ:

۱۔ الطاف فاطمہ، خواب گر، لاہور: جمہوری پبلیکیشنز